سر سیّد اور سیکولرزم

مجاہد حسین

لیکچرار اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج فار بوائز شالیمار ٹاؤن، لاہور

SIR SYED AND SECULARISM

Sir Syed was one of the greatest educationist and social reformers. He extricated the Muslims from the meshes of medievalism and out-mode patterns of thoughts and behavior. He was secular in approach and a nationalist. Moreover, he was a profounder of Hindu-Muslim unity. In 1878, Sir Syed was nominated to the Viceroy's Legislative Council. He testified before the education commission to promote the establishment of more colleges and schools across India. In the same year, Sir Syed founded the Muhammadan Association to promote political co-operation amongst Indian Muslims from different parts of the country. In 1886, he organized the All India Muhammadan Educational Conference in Aligarh, which promoted his vision of modern education and political unity for Muslims. His works made him the most prominent Muslim politician in 19th century India, often influencing the attitude of Muslims on various national issues.

KEYWORDS: *Sir Syed Ahmed Khan, Secularism, Naturalism, Abu-al Kalam Azam, Deputy Nazir*

Ahmed, Dr. Shaikh Muhammad, Abdullah, Geographical Influence, Political Influence, Religious Aspects, Different Religions, Hindustani Mulla's, Politics.

کلیدی الفاظ: سر سیّد احمد خاں، سیکولرزم، نیچری، ابوالکلام آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ، جغرافیائی اثر و رسوخ، سیاسی اثر و رسوخ، مذہبی پہلو، مختلف مذاہب، ہندوستانی ملّاں، سیاست۔

سر سیّد احمد خاں ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ان کی پوری زندگی علم و عمل سے عبارت ہے اوران کی خدمات کا دائرہ مختلف جہات پر پھیلا ہوا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا، اپنے حسن تدبیر سے اسے سدا بہار بنادیا۔ سر سیّد دہلی کے ایک معزز خانوادہ کے چشم وچراغ تھے۔ان کے اسلاف مغل تاجدار شاہ جہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور شاہی حکومت میں اہم مناصب سے وابستہ رہے۔ سر سیّد کی ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں اکبر شاہ ثانی بر سرِ اقتدار تھے اوران کی سلطنت لال قلعہ تک محدود تھی۔ سلطنت کی معاشی صورت حال روز افزوں خراب ہوتی جارہی تھی۔ اس زمانہ میں یورپی تہذیب کے اثر سے جو تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں ان کے نتیجے میں قدیم اور جدید افکار و نظریات کی کشمکش بھی اپنے عروج پر تھی۔ تغیر اور تبدیلی کی ان علامتوں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر بھی کیا تھا اور منتشر بھی۔ لیکن شورش اور انتشار کے زمانہ میں بھی دہلی میں شعر و ادب اور دوسرے علوم و فنون کی ترقی ہوئی جس کی تفصیل تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہے۔

خود سر سیّد نے اپنی معروف تصنیف 'آثار الصنادید' کے چوتھے باب میں آخری مغل بادشاہوں کے عہد میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا ذکر کیا ہے۔ دراصل قوموں اور حکومتوں کا عروج وزوال تاریخ کا مسلسل عمل ہے۔ مغل تاجداروں نے بھی ہندوستان

میں سولھویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک اپنے شاہان جاہ و جلال اور شان و شوکت کا چراغ روشن کرر کھااور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس کے بعد وہ قصہ پارینہ بن گئے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی سیاسی شکست بھی ان اعلیٰ تہذیبی قدروں کو پامال نہ کر سکی جو ہند ایرانی تہذیب کے امتزاج سے ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ سر سیّد اسی تہذیبی روایت کے ساختہ پرداختہ تھے۔ کم و بیش ڈھائی سو سال تک ان کے خاندان کے افراد تھے۔ کم و بیش ڈھائی سو سال تک ان کے خاندان کے افراد نے مغلیہ حکومت کی خدمات انجام دیں۔ سر سیّد کے دادا سید ہادی کی خدمات کے اعتراف میں عالمگیر ثانی نے انھیں جواد علی خاں کا خطاب دیا تھااور بعد میں شاہ عالم نے انھیں دوسرے خطابات کے ساتھ قاضی لشکر اور عہدۂ احتساب ان کے سپرد کی۔ سر سیّد کے والد بزرگوار سید متقی کو بادشاہ وقت سے خصوصی قربت تھی اور شاہی محل میں بے روک ٹوک جانے کی اجازت تھی۔

اس سے بادشاہ سے ان کے روابط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن سید، متقی درویش صفت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاہ غلام علی سے بیعت تھے۔ شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا بین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سر سیّد کی رسم بسم اللہ انھی سے کرائی تھی۔ سر سیّد کا بچپن اپنے نانیہال اور شاہ غلام علی کی صحبت میں بسر ہوا۔ سر سیّد کے نانا خواجہ فرید الدین احمد مشہور عالم تھے اور علم ریاضی میں انھیں بطور خاص دسترس حاصل تھا۔ ان کے نانا کا ذاتی کتب خانہ تھا، سر سر سیّد نے اس سے استفادہ کیا۔ سر سیّد کی تربیت میں ان کی والدہ ماجدہ اور ان کے نانا کا نمایاں حصہ ہے۔ سر سیّد کی والدہ عزیز النساء بیگم دور اندیش اور دردمند خاتون تھیں۔ سر سیّد ابھی کم سن تھے کہ والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لہذا ان کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری والدہ پر آن پڑی اور انھی کی تربیت کے نتیجے میں سر سیّد کو اعلیٰ نصب العین کے لیے تلخ حقائق سے نبرد ہونے کا گُر آتا تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد سر سیّد نے علوم متداولہ کی تحصیل کی تھی۔انھیں بچپن سے مطالعہ کا غیر معمولی شوق تھا۔زبان وادب اور فلسفہ کے علاوہ انھیں علم ریاضی اور تاریخ سے گہرا شغف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی جید علما، ادبا، شعرا، حکما کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی۔ سر سیّد نے ان اکابرین روزگار سے کسب فیض کیا۔اس کے ساتھ ہی قلع معلیٰ سے دیرینہ روابط کے توسط سے آداب شاہی اور انصرام سلطنت سے واقفیت بہم کی لیکن یہ بھی واقع ہے کہ مغل تاجدار سے روابط اور عزیزوں کی مخالفت کے باوجود سر سیّد نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔

'سیکولرزم' لفظ 'سیکولر' سے مشتق ہے، جو انگریزی لفظ ہے جس کے لغوی معنٰی 'لادینیت' ہیں۔ مگر سیکولرزم کے معنی کے معاملے میں مغربی نقطۂ نظر اور ہندوستانی نقطۂ نظر میں کسی حد تک فرق ہے۔ کیونکہ یورپ میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے لوگوں کے غور و فکر میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور پروانی روایات پر بھی غور و فکر کیا گیا اور پرانے رسم ورواج کو جو صرف توہمات پر مبنی تھا یا پھر مذہبی عقائد کی وجہ سے کٹرپن آگیا تھا۔ان سب باتوں کو سائنسی اور عقلی نقطۂ نظر نے ناقابل قبول قرار دے دیا جبکہ مشرقی نقطۂ نظر سے سکولرزم کے تحت مذہب کو سیاست سے آزاد رکھا گیا اور یہی وجہ تھی کہ آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں لا مذہبی جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی۔ جہاں سبھی مذاہب کو اپنے اپنے طور پر پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور سیکولر مزاج ہی تھا کہ علامہ اقبال نے اپنے ابتدائی دورِ زندگی میں قومیت کو غیر متعصب نقطہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی تلقین کی تھی اور کہا تھا کہ ہم ہندوستانی ہونے کی وجہ سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں اور اس کے بعد کسی مذاہب کے ماننے والے ہیں جس کی عمدہ مثال ان کی نظم 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ آگے چل کر بعض وجوہ کی بنا پر وہ جمال الدین الحسینی افغانی کے پان اسلامزم (Pan Islamism) کے قائل ہوئے اور کہا کہ 'مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا'۔ کیونکہ علامہ اقبال کے خیال میں پان

اسلامزم کا نظریہ اسلامی نقطۂ نظر کا حامل تھا۔ اس کے لیے ایک بہت بڑی لفظی معرکہ آرائی مولانا حسین احمد مدنی سے چل پڑی۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں مولانا حسین احمد مدنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں کہا تھا کہ :

سرود برسر

منبر کہ ملت از

وطن است

چہ بے خبر زِ

مقام محمد

عربیت

یعنی وہ شخص جو ملت کو وطن کے ساتھ منسوب کرتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے مقام کو ہی نہیں جانتا بلکہ اس بات پر مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر اقبال میں ایک عرصے تک بحث چلی اور آخر میں ڈاکٹر اقبال نے اپنی دریدہ ذہنی کا اقبال کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا۔ یہاں اس بات سے یہ نتیجہ نکلا کہ مغربی نقطۂ نظر کے مطابق قوم کا تصور جغرافیائی حدود یا کسی ایک فرقے کے ہم خیال کثیر افراد کا کسی ایک حاکم کے زیرِ حکومت ہو جانا قومیت کی تعریف میں آتا ہے۔ سر سیّد جمال الدین افغانی کے پان اسلامزم سے متفق نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس وقت ہمیں بین الا قوامی صورت حال سے ہٹ کر ملکی یا قومی صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہئے جس کے لیے ہندوستانی قوم کو خصوصاً مسلمانوں کو اعلیٰ سائنسی علوم کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک عوام کے اندر تعلیم نہیں آئے گی اس وقت تک ملک کے اندر قومی اتحاد اور سماجی و معاشرتی فلاح و بہبود نہیں ہو سکتی۔

سر سیّد کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ سر سیّد کوئی ایسا قانون یا کلیہ وضع نہیں کر رہے تھے جس میں کسی طرح کی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ جس

شخص کی نظر زمانے کے نشیب و فراز پر گہری ہو اور جس کی انگلیاں زمانے کی نباض ہوں تو وہ بدلتے وقت اور حالات سے کیسے چشم پوشی کر سکتا تھا۔اب اسے مصلحت کوشی یا کوئی اور نام دیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔انھیں ایک ہی فکر رہتی تھی کہ مسلمانوں کی بدحالی کیسے دور ہو اور اس بدحالی کو دور کرنے کے لیے ان سے جو بن پڑا اس سے گریز نہیں کیا۔

سر سیّد دوسری قوموں کی بھلائی بھی چاہتے تھے لیکن مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہہ تھی اس لیے انھوں نے ان کے مسائل کو زیادہ سنجیدگی سے لیا۔ہندوستان کی ترقی کے لیے دونوں قوموں کی اہمیت کو یکساں تسلیم کرتے تھے جس کا اظہار خود انھوں نے اپنے پرچے 'تہذیب الاخلاق' میں کیا تھا کہ :

> 'ہندوستان ایک خوبصورت دلہن کی مانند ہے اور ہندوستان اس کی دو آنکھیں ہیں۔''[i]

گویا ہندوستان کی خوب صورتی،اس کی عظمت کسی ایک قوم کے دم سے ممکن نہیں۔اگر مسلمان قوم بدحال و پریشان رہتی ہے تو اس سے ہندوستان کی معاشی، تعلیمی، سیاسی اور سماجی زندگی بہتر نہیں ہو سکتی۔اس لیے سر سیّد نے اگر مسلمانوں کی فکر زیادہ کی تو مجموعی طور سے اس میں ہندوستان کی فلاح و بہبود مضمر تھی۔سر سیّد کی شخصیت ممتاز قوم پرور اشخاص میں سے تھی ان کے افکار و کارناموں میں وہ تمام خوبیاں ملتی ہیں جنھیں آج ہم سیکولرزم کہتے ہیں۔سر سیّد کی تخلیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب پر ان کا پختہ عقیدہ تھا اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے شرارت پسندوں کے اسلام پر لگائے گئے الزامات کا منہ توڑ جواب دیا ہے۔

سر سیّد کے مطابق اعلیٰ مغربی تعلیم ہندو مسلمان دونوں کے لیے ضروری ہے۔حالانکہ ہندو بھائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت زیادہ پست تھی۔اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے ابتدا میں اسلامی مدرسے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا دروازہ ہندو

مسلمان دونوں کے لیے یکساں طور پر کھولا تھا۔ یہاں تک کہ کالج کے بانیوں اور منتظمین میں دونوں فرقوں کے لوگوں کو شامل کی جس سے سر سیّد کے سیکولر خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ سیکولرزم اور قوم دونوں کے لیے صاف طور پر اردو زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ہے جو قوم اور سیکولر لفظ کے صحیح مفہوم کو ادا کر سکے۔ مثلاً نیشن (Nation) کے لیے بھی لفظ قوم استعمال ہوتا ہے اور کمیونٹی (Community) کے لیے بھی لفظ قوم ہی رائج ہے۔ اس لیے جب لفظ 'قوم' بولا جاتا ہے تو کبھی کمیونٹی اس کے معنی ہوتے ہیں اور کبھی اس کے معنی قوم کے ہوتے ہیں۔ سر سیّد کے مختلف بیانات اور خطبات میں جب لفظ قوم استعمال ہوتا ہے تو کہیں پر اس کے معنی مسلم فرقے کے بطور ہوئے اور کہیں پر قوم۔ جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ دو قوموں کی عادتوں اور طبیعتوں کا اختلاف ملک کی جغرافیائی خاصیت پر منحصر بتاتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ:

> ''یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں، گو ان میں دوسرے ملکوں کے لوگ بھی آکر بس جاتے ہیں، وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔۔۔اے ہندو مسلمانو کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ہی ایک قوم ہیں۔''[ii]

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے ایک بار سر سیّد سے سوال کیا تھا اور انھوں نے اپنے سیاسی مسلک پر کسی اثر کی پرزور تردید کرتے ہوئے اس کو حالات کے تجزیے کا نتیجہ بتایا تھا۔ یہ حالات کیا تھے اور کیوں پیدا ہوئے تھے؟ کوئی دیانتدار مؤرخ ان عوامل و اثرات سے لاعلمی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ سر سیّد کا تصور قومیت

اس زمانے کے ہندوستان میں ایک بالکل نئی آواز تھی۔ شاید ہی کسی دوسرے ہندوستانی نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار اس جرأت، خلوص اور سچائی سے کیا ہو جیسا کہ سر سیّد نے ۳فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں کہا تھا،انہوں نے کہا تھا کہ :

> 'لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے لیکن جو بات ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔۔۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔۔۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بناپر ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ 'ہندو' یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔۔۔ جس زمانے میں، میں قانونی کاؤنسل کا ممبر تھا مجھ کو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔'' iii

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ان کے سیاسی افکار سے متفق نہیں تھے، کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر ہندوستان نے سر سیّد کی اس رائے کی روح کو سمجھا ہوتا اور اس کی پیروی کی ہوتی تو آج ملک کی تاریخ کا رخ دوسرا ہوتا۔

سر سیّد کے خیالات اب تمام ملک میں پھیل چکے تھے۔ان کے خیالات کی تائید مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ ہندوؤں کی طرف سے بھی ہونے لگی تھی۔ جس وقت وہ علی گڑھ کالج کے لیے چندہ مانگنے پنجاب پہنچے تو وہاں کے جلسوں پر ہر گورنمنٹ اسکول کی طرف سے سر سیّد کو ایک ایڈریس پیش کیا گیا جس کو لالہ بھگت رام نے پڑھا جس میں سر سیّد کی حُب الوطنی اور قومی یکجہتی کا بھرپور اعتراف کیا۔اسی طرح انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے

سیاست نامہ جس پر دستخط کرنے والوں میں ۱۴ ہندو اور صرف ۵ مسلمان تھے۔ سر سیّد کو بہترین الفاظ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ ایم اے او کالج کے افتتاح کے بعد پہلا ایڈریس جو مہاراجہ سریندر سنگھر بہادر والئی پٹیالہ کو دیا گیا اس موقع پر سر سیّد نے کالج کی پالیسی کا بھی اظہار کیا۔

قوم و قومیت جیسے الفاظ کی اصطلاح کو وسیع مفہوم میں دوبارہ رائج کرنے کا سہرا اگرچہ سر سیّد کے سر ہے اور انھوں نے ہی مسلمانوں کی بدتر حالات کو سمجھ کر پھر سے ترقی کے راستے پر چلنے کی طرف راغب کیا۔ اس سلسلے میں 'حیات جاوید' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت دو قومی ہمدردی اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام طور پر بولے جاتے ہیں۔ یہ درحقیقت سر سیّد ہی کی تحریریوں نے جو اوّل سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئیں لوگوں کو بولنے سیکھائے ہیں۔"[iv]

سر سیّد نے ۲۶ جنوری ۱۸۸۶ء کو اپنی تقریر جو انجمن اسلامیہ امرتسر کے زیر اہتمام کی تھی اس میں قومی ترقی کے بارے میں جو باتیں انھوں نے کہی تھیں اس کا ذکر توقیر عالم نے اس طرح کیا ہے:

> "مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی سے ہے۔ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے اور جو افسوس ناک محرومی ان کو یورپین سائنسز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کو رفع کرنے کو قائم کیا گیا ہے۔ مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں ہی پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے وہ دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم

لوگ آپس میں کسی کو ہندو اور کسی کو مسلمان کہیں، مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹیو یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگارام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔" v

معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے تو سر سیّد کو سیکولر مانا ہی جاتا ہے کیونکہ سیاسی اور معاشی معاملوں میں سر سیّد نے ہندو اور مسلمان دونوں کو نفع اور نقصان میں برابر کا شریک مانا اور ان کی تعلیم و ترقی کے لیے دونوں قوموں کو برابر کا درجہ دیا۔ لیکن مذہبی معاملے میں سر سیّد نے فراخ دلی سے کام لیا۔ اگرچہ وہ اسلام کے سچے حمایتی اور پیرو تھے اور اعتقاد کے معاملے میں نہایت مستقل پیرو مذہب تھے اور اسلام کو سچا مذہب مانتے تھے اور اسی اسلامی قوانین کی سچائی کے لیے دوسرے مذہب والوں کی کتابوں کا مطالعہ کر کے نہایت فراخ دلی سے ان سب باتوں کو جو دوسرے مذہبوں میں حقیقت پسندانہ تھیں اور جو اسلامی قوانین کی تائید بھی کرتی تھیں ان باتوں کو دیگر مذاہب کی مذہبی کتابوں سے تلاش کر کے سامنے رکھا اور ان شہادتوں پر اپنے مذہب کی سچائی کی تائید کی۔ یہی فراخ دلی انھوں نے بائبل کی تفسیر لکھ کر اور قرآن و حدیث سے اس کی تطبیق کرنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ ان کی تصنیف 'تبین الکلام' اس سلسلے کی بڑی معرکے کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے لکھنے پر ان کو عام مسلمانوں کی ناراضگی اور کفر کے فتوؤں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر کوئی مسلمان ایسی کتاب لکھے جس کا مقصد 'انجیل' کی مقدس تفسیر لکھنا اور اس کی تائید کرنا اور اس کو آسمانی کتاب ماننا ہو تو بلاشبہ عام لوگ ان سے متنفر ہوں گے۔ کیونکہ زمانۂ سلف میں کسی نے بھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔

بقول حالی 'تبین الکلام' کی اشاعت کے بعد مولوی مہدی علی طرف نواب محسن الملک جیسے رفیق اور دوست نے بھی سر سیّد پر چھاپا پادری ہونے کا الزام لگایا اور تکفیر کا فتویٰ دیا۔ vi

سر سیّد کی یہ جوانمردی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے عیسائیت اور اسلام کی اچھی اچھی باتوں کو اکٹھا کر کے اس بات کا فراخ دلی سے ثبوت دیا کہ دوسرے مذہب کی کتابوں میں جو باتیں اچھی ہیں ان کو بلا کسی تعصب کے قبول کرنا چاہئے۔ یہ سب کام سر سیّد نے صرف اس لیے کیا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو۔ کیونکہ قرآن مجید کے مطابق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ سر سیّد کا خیال سیکولرزم کی طرف مائل تھا اور وہ فرقہ واریت کو انسانی برادری کے لیے ایک بلا سمجھتے تھے۔ عیسائی فرقے کو اہل کتاب مانا جاتا ہے اور ان کے ساتھ کھانا، پینا، رہنا اور دوستانہ تعلقات مذہب کے منافی نہیں مانا جاتا۔ سر سیّد نے اس معاملے میں یہ اضافہ اور کیا کہ لباس، وضع قطع اور کھانا پینا جیسی باتوں میں انگریزوں کے طریقے کار کو پسند کیا۔ عام اور خاص مسلمانوں میں جو لباس، رہن سہن کے طریقے اور کھانے پینے کے انداز رائج ہو چکے تھے ان کو ترک کرنے کا مشورہ دیا جس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ صفائی اور خوشحالی میں رہن سہن کے وہ آداب جو انگریز قوم میں رائج ہیں بہت مفید اور عزت و وقار کو بڑھانے والے ہیں۔ اس بات پر پڑھے لکھے مسلمانوں نے اور خاص طور پر علمائے ملت نے اعتراضات کیے یہاں تک کہ سر سیّد کو 'نیچری، لا مذہب اور چھاپا پادری' تک کہہ ڈالا۔ مگر سر سیّد نے جو باتیں اپنی عقل و شعور سے اسلام کے بنیادی اصولوں کو پسند کیا اور رسم و رواج سے جو باتیں معاشرے میں داخل ہو گئی تھیں ان کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں بے کار کی بحث تھی۔ جن سے سچے اسلام کے پیرو کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دنیاوی رسم و رواج ان کے خیال میں نہ صرف گمراہ کن ہوتے ہیں بلکہ اس کی پیروی میں قیمتی مال و اسباب صرف ہو جاتے ہیں۔

عتیق احمد صدیقی کے خیال کے مطابق یہ حقیقت ہے کہ سر سیّد کا ذہن فرقہ پروری کی آلودگی سے کبھی پاک نہیں تھا تاہم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاسی تنظیموں کے خاردار تھے اور انھوں نے اپنے دامن کو الجھنے سے بچایا۔ لیکن محمڈن اورینٹل ایسوسی ایشن نے

صورت حال اس حد تک بدل دی کہ سیر امیر علی جو فرقہ پرستی اور برطانیہ نوازی میں سر سید سے بہت آگے تھے انھوں نے بھی اس ایسوسی کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

> ''خود انھوں نے محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن بنائی جو میرے خیال میں ایک نامسعود قدم تھا اور جیسے اشتعال انگیزی پر محمول کیے جانے کا امکان تھا۔''[vii]

ہمارے خیال میں عتیق صاحب کا یہ خیال کہ سر سیّد کا ذہن فرقہ پروری کی آلودگی سے اگرچہ کبھی پاک نہیں رہا وہ سر سیّد کے ساتھ کسی قدر ناانصافی ہوگی۔ کیونکہ ان کی ابتدائی زندگی سے لے کر اور سرکاری ملازمت میں آنے تک اور سرکاری ملازمت کے زمانے میں کوئی ایسی مثال نمایاں طور پر ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر نہیں ہوتی کہ انھوں نے مسلمانوں کے علاوہ دسرے فرقہ والوں کو نظر انداز کیا ہو۔ خاص خاص موقع پر یہ دیکھنے میں آیا کہ دوسرے مذہب والوں کی خاطر خدمت میں انھوں نے وہی جانفشانی اور ہمت اور جرأت دکھائی جو اپنے فرقے والوں نے برتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے حادثے کے بعد انھوں نے ہندو بچوں، بڑوں اور بزرگوں کی ویسی ہی حفاظت اور پرورش کی جیسی وہ اپنے ہم مذہبوں کی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں شیکسپیئر کی جان و مال کی حفاظت میں انھوں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا اور ان کی حفاظت میں اپنے فرقے کے مسلمانوں کو صاحب موصوف پر حملہ آور نہیں ہونے دیا اور خود دن ورات شیکسپیئر کے بچوں اور مکاں کی حفاظت تن تنہا کرتے رہے جس سے یہ بات تو ظاہر ہوگئی کہ نیکی کے کام میں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے وہ کس مذہب، فرقے یا قوم کا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ کچھ ان کے ساتھیوں کی بے وفائی ان کے دل میں ان ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف بد ظنی پیدا کر دی تھی جس سے ان کا اعتماد ہندوؤں کی طرف سے اٹھ گیا تھا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ راجہ شیو پرساد جو مہاراجہ بنارس کے وزیر اور سر سیّد کے گہرے دوست اور شریک کار بھی تھے جب انھوں نے اردو ہندی کا سوال اٹھایا تو سر سیّد کا ذہن اس قدر بدلا کہ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اب ہندو مسلمان یکجا رہنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ راجہ شیو پرساد کے بارے میں مسٹر ہیوم کی رائے کا کچھ حصہ درج کیا جاتا ہے جو عتیق احمد کی کتاب 'سر سیّد کا سیاسی مطالعہ' میں اس طرح منقول ہے:

> ''قدیم برطانوی عملے کے ایک فرد تھے برسوں پہلے پچھلے درجے کے سرکاری ملازم رہے۔۔۔انھوں نے ایک خاص حیثیت حاصل کر لی لیکن دیسی صحاب میں کلکتے سے لے کر پشاور تک کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی ان کی عزت ہے۔۔۔''[viii]

سر سیّد کی بے تعصبی یا سکولرزم کی بابت مولانا الطاف حسین حالی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے خیال میں اور دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والے اشارات سے زیادہ قابل تسلیم ہے۔ مولانا حالی نے پہلے تو اپنے دیباچہ میں یہ بات نہایت زور دے کر کہی ہے کہ ہمارے بہت سے احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے بادشاہ اور دانش مند وزیر اور بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو پیش تھے وہ براہ راست کچھ رہبری نہ کر سکے۔ جن حالات میں ہمارے بزرگوں نے اپنے کارناموں کو انجام دیا ہے وہ ہمارے حالات سے بالکل جداگانہ ہیں۔

سر سیّد کی زندگی ہمیں سبق دیتی ہے کہ زمانے کی مخالفت کو سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کر دیں اور دنیا میں آرام سے عزت کی زندگی بسر کریں۔ سر سیّد کی ترقی کے اسباب جو کچھ ۱۸۵۷ء کے بعد ظہور میں آئے وہ ان کے لیے بچپن ہی سے تیار تھے۔ حالی

کہتے ہیں کہ سر سیّد کے اخلاق، عادات و خیالات کا دنیا پر روشن کرنا اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ عادات و خیالات کہاں سے آئے۔ انسان کی کچھ خصلتیں فطری طور پر اپنے بزرگوں سے ملتی ہیں اور وہی اخلاق و عادات ان کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں جو بچپن سے نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان یا سوسائٹی سے سیکھتے ہیں اور یہ اکتسابات رفتہ رفتہ اس درجے تک پہنچ جاتی ہے جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جاتے تو ٹل جاتے لیکن آدمی اپنی جبلت سے نہیں ٹل سکتا۔ اس لیے سر سید کے ان عادات واطوار پر ان کی ماں کا بہت زیادہ اثر قائم ہوا۔ بچپن سے سر سید پر نہ تو ایسی پابندی تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل پابندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کے ماموں، ان کی خالہ اور دیگر رشتے داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے۔ ان کے بزرگوں کی طرف سے اجازت تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ انھوں نے یہاں تک اجازت دے دی تھی کہ سب بھائی مل کر گٹیریاں بھی کھیلو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سر سیّد کی مذہبی زندگی میں دو باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت کم ہی ملتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ باوجود اس کے مذہبی تعصبات سے وہ بالکل پاک تھے۔ جس بے تعصبی سے انھوں نے مقدمات کے فیصلے کیے اور جس طرح ہر مذہب وملت کے لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بحیثیت جج کے بے طرف دارانہ رہا۔ ہر قوم اور ہر فرقے کے لوگوں نے اس کو برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال ان کے برتاؤ، دوستی و ملاقات اور سماجی معاملات میں تھا اور یہی رنگ ان کے مذہبی جھگڑوں کے متعلق بھی تھا جو سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد اور ہندو مسلمان میں ہمیشہ پیش آتے تھے۔ ان معاملات کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے حل کیا اور یہی وجہ تھی کہ سر سیّد ہمیشہ

جلسوں میں جہاں ہندو مسلم جمع ہوتے تھے دونوں قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی نصیحت کرتے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر انھوں نے ایک تقریر میں کہا تھا:

> "گائے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے اس کی نسبت وہ صاف صاف کہتے تھے کہ اگر ہم میں اور ہندؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔"[ix]

ایک سال بقر عید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے مل کر ایک گائے قربانی کرنے کے لیے خریدی۔ عین بقر عید کے دن نماز کے بعد جب سر سیّد کو یہ خبر ملی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے، یہ سن کر وہ از خود رفتہ ہو گئے۔ فوراً گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگادی اور وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اس کے مالک کو واپس کرادی۔ طالب علموں کو آئندہ کے لیے قطعی ممانعت کر دی کہ کالج کے احاطے میں کبھی کوئی ایسانہ کرنے پائے۔

ہندوستانی قومیت واتحاد کے سلسلے میں سر سیّد کے افکار وخیالات کا برملا اظہار کچھ یوں ملتا ہے۔ ہندوستان چونکہ مختلف قوموں وتہذیبوں کا سنگم ہے لہذا آپسی بھائی چارگی کو بنائے رکھنے کے لیے ہندؤں اور مسلمانوں میں برادرانہ تعلقات واتحاد کی ضرورت ہے اور ان کی پہچان صرف اور صرف مندر اور مسجد کے کہیں اور نہ ہو۔ ایک موقع پر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا جب انھوں نے بریلی کے ہندو و مسلمانوں کے اتحاد کا ذکر سنا کہ بریلی کے مسلمانوں نے بقر عید کے موقع پر گائے کی قربانی نہیں کی اور محرم کے موقع پر ہندؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر محرم منایا۔ سفر پنجاب کے دوران انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ ایک ملک میں سبھی رہنے والے ایک قوم کہلاتے ہیں اور یہ کہ ہندو، مسلمان،

عیسائی یہ سب مذہبی الفاظ ہیں کیونکہ ملک میں رہنے والے سبھی افراد ملک کی ترقی اور بہبود میں اپنا اپنا کردار بخوبی ادا کرتے ہیں۔[x] اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مذہب کے نام پر ملک میں قوموں کی پہچان ہو۔ موصوف نے اپنے اکثر و بیشتر تقریروں میں ان باتوں کا ذکر کیا ہے کہ :

> ''ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوب صورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانی وہ جائے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو،اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ یا کانا۔''[xi]

مذکورہ سفر کے دوران ہی انھوں نے ہندو مسلم یگانگت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ :

> ''ہندوستان میں رہتے سہتے دونوں کو خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندؤں کی سینکڑوں رسمیں و عادتیں لے لیں۔ یہاں تک کے ہم دونوں نے آپس میں ملکر ایک نئی زبان پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی، نہ ان کی۔ در حقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بہ اعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔''[xii]

سر سیّد نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے اس کا اظہار انھوں نے اس طرح سے کیا ہے :

''میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر ان کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں ان میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو۔ مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اس دستر خوان پر بیٹھنے والوں کو باہم رنج نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنجش پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اس پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ جس چیز کا یقین اس کے جی میں ہے اسی کو وہ اختیار کرے گا اور وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اس کے لیے اور برا ہے تو اس کے لیے۔ لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے اس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا۔''[xiii]

****

حوالہ جات

[i] سر سیّد احمد خاں، سفر نامہ پنجاب، مرتبہ اقبال علی، علی گڑھ، ۱۸۸۴ء، ص ۱۲۷

[ii] سراج الدین، سیّد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ، مرتبہ، کشمیری بازار لاہور، ۱۸۹۰ء، ص ۱۷۹

[iii] سر سید احمد خاں، سفر نامہ، ص ۱۲۷

[iv] مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۳۵۷

v توقیر عالم، سر سید احمد خاں کا سفر پنجاب، بحوالہ سر سید کا اصلاحی مشن، ص ۱۰۶

vi الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۱۲۵

vii عتیق احمد صدیقی، سر سید احمد خاں کا سیاسی مطالعہ، جامعہ مکتبہ نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۹۰

viii عتیق احمد صدیقی، سر سید احمد خاں کا سیاسی مطالعہ، ص ۲۸۱

ix الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۷۸۵

x سر سید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ، ص ۱۷۹

xi سسید احمد خاں، سفر نامہ پنجاب، ص ۹۴

xii سراج الدین، مرتبہ، سر سید احمد خاں کے لیکچروں کا مجموعہ، ص ۱۳۵

xiii الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۷۸۶